اُسوۂ رسول ﷺ

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں ☆

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ۞ وَلَمَّا رَاَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ ۙ قَالُوۡا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ ۫ وَمَا زَادَھُمۡ اِلَّاۤ اِیۡمَانًا وَّتَسۡلِیۡمًا ۞ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیۡہِ ۚ فَمِنۡھُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَہٗ وَمِنۡھُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ ۫ وَمَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِیۡلًا ۞ لِیَجۡزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیۡنَ بِصِدۡقِھِمۡ وَیُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ اِنۡ شَآءَ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡھِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۞ وَرَدَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِغَیۡظِھِمۡ لَمۡ یَنَالُوۡا خَیۡرًا ؕ وَکَفَی اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الۡقِتَالَ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیۡزًا ۞ وَاَنۡزَلَ الَّذِیۡنَ ظَاھَرُوۡھُمۡ مِّنۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ صَیَاصِیۡھِمۡ وَقَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الرُّعۡبَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَتَاۡسِرُوۡنَ فَرِیۡقًا ۞ وَاَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَھُمۡ وَدِیَارَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ وَاَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡھَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا ۞﴾ (آیات ۲۱ تا ۲۷)

خطبۂ مسنونہ ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

حضرات! ان آیات پر ہماری گفتگو دو حصوں میں ہو گی۔ ایک تو ان شاء اللہ ہم

☆ سورۃ الاحزاب کی آیات ۲۱ تا ۲۷ پر مشتمل یہ درس محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے اپنے مسلسل درس قرآن کریم کے دوران جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں مئی ۱۹۷۹ء میں دیا۔

درس کی صورت میں اس رکوع کو ختم کریں گے۔ پھر اس رکوع میں اسوۂ حسنہ سے متعلق جو مضامین آئیں گے' ان کو ہم صرف علمی اعتبار ہی سے سمجھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ اس رکوع کے مضامین کی جو تعلیم عملی انطباق (Practicable Application) سے متعلق ہے اور ہمارے لئے اس میں جو عملی سبق ہے اس کو میں بعد ازاں ایک تقریر کی شکل میں کسی قدر وضاحت سے آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ارشاد ہوا :

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾

''یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔''

اُسوہ کے لفظ کا مادہ ''اس و'' ہے۔ اُسوہ اور اِسوہ دونوں اس کے تلفظ ہیں۔ جس طرح قُدوہ اور قِدوہ دونوں ہم معنی ہیں' اسی طرح لفظ اُسوہ اور اِسوہ دونوں استعمال ہوتے ہیں' اور اس کا معنی و مفہوم ہے کسی کا اتباع کرنا' اور اس اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لینا' خواہ اس میں کوئی تکلیف ہو خواہ مسرت۔ چنانچہ کسی کے اتباع کو اپنے اوپر مسرت و راحت اور تکلیف و مضرت دونوں کیفیات میں لازم کر لینا اسوہ ہو گا۔ اردو میں جب اس لفظ کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا جائے گا تو ''نمونہ'' اس کے قریب ترین مفہوم کا حامل ہے' لیکن اس ترجمے سے ''اسوہ'' کا حقیقی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اصل میں ''اتباعِ سنت'' کی جو اصطلاح ہمارے ہاں زیادہ معروف ہے اسی کی ایک نہایت حسین و جمیل تعبیر لفظ اسوہ میں موجود ہے۔

یہاں ''لَکُمۡ'' (تمہارے لئے) عام ہے۔ گویا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں ہیں' بلکہ تا قیامِ قیامت تمام مسلمانوں کے لئے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیاتِ طیبہ ایک اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے۔

قرآن مجید اور اُسوۂ رسولؐ میں ایک قدرِ مشترک

آگے فرمایا: ﴿لِمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ۞﴾ یہ درحقیقت ''لَکُمۡ'' کا بدل آ رہا ہے ___ آیت کے اس ٹکڑے میں وہ دونوں مفاہیم جمع کر دیئے گئے ہیں جو قرآن مجید کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں دو مختلف مقامات پر

آئے ہیں۔ قرآن اپنی جگہ ہر نوع بشر کے لئے ہدایت کاملہ اور ہدایت تامہ ہے۔ اس میں تا قیامِ قیامت ہر دَور میں تمام نوعِ انسانی کے لئے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور یہ ہر اعتبار سے اکمل واتم ہے۔ چنانچہ قرآن کو ''ھُدًی لِّلنَّاسِ'' کہا گیا ہے۔ (البقرہ:۱۸۵) یہ علی الاطلاق ہے' یعنی یہ تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ لیکن سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں اس قرآن کو ''ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ'' قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس ہدایت سے استفادہ کرنے کی ایک شرط ہے' اور وہ تقویٰ ہے۔ یعنی کچھ خدا ترسی ہو' کچھ اللہ کی طرف انابت ہو' نیکی اور بدی کا کوئی شعور بیدار ہو' انسان خیر وشر میں امتیاز کرتا ہو۔ چنانچہ تقویٰ کا اساسی سرمایہ اور بنیادی اثاثہ اگر موجود نہیں ہوگا تو انسان اس قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا۔ قرآن اپنی جگہ ہدایتِ کاملہ و تامہ ہے' لیکن اس سے استفادے کے لئے جو شرط خود انسان کے باطن میں پوری ہونی چاہئے وہ شرط تقویٰ ہے' لہٰذا سورۃ البقرۃ کی آیت ۲ میں ارشاد ہوا: ﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ۛ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۞﴾ اور آیت نمبر ۱۸۵ میں فرمایا: ﴿شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾

آپ میں سے شاید بعض حضرات کے علم میں ہو کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی بدنامِ زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے تھے ان میں پہلا اعتراض یہی تھا کہ یہ عجیب کتاب ہے جو کہتی ہے کہ یہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ متقیوں کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں' فاسقوں اور فاجروں کو ہے۔ قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کرنے والوں کو یہ اشکال پیش آ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ انسان بہت نیک ہو' بہت خدا ترس ہو' اور وہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے ہوئے ہو' یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں محتاط ہو۔ ایسے شخص کو ہم متقی کہتے ہیں۔ لہٰذا ان معانی میں جب لفظ تقویٰ سامنے آتا ہے تو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے بارے میں واقعتاً ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ وہ اشکال انتہائی بھونڈے طریقے پر اُس شخص نے پیش کیا۔ تو اِس کا حل یہی ہے کہ قرآن مجید در حقیقت ''ھُدًی لِّلنَّاسِ'' ہی ہے' لیکن اس سے استفادے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ تقویٰ کا کچھ نہ کچھ بنیادی اثاثہ موجود ہو۔ ایک شخص میں اگر نیکی اور بدی اور خیر وشر کی تمیز کی کچھ بھی پونجی باقی ہے تو گویا وہ بنیاد موجود ہے جس پر ہدایت کا دارومدار ہے۔ آج کل کی تعمیرات کی ٹیکنیک میں اسے starter کہتے ہیں ___ یعنی اگر آپ کو عمارت کا کالم مزید اوپر لے جانا ہے تو کچھ سریئے باہر نکلتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ اوپر کے کالم کو چڑھاتے وقت اس کا جوڑ اُس کے ساتھ لگ جائے۔ پس جس طرح کسی عمارت کے کالم کو مزید اُوپر لے جانے کے لئے starter کا ہونا ضروری ہے' اسی طرح قرآن مجید سے استفادے کے لئے تقویٰ یعنی خیر وشر اور نیکی و بدی کی کچھ نہ کچھ تمیز انسان میں ہونی ضروری ہے۔

بعینہٖ یہی بات اسوۂ رسول ﷺ کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پوری نوع انسانی کے لئے بھی مجسم ہدایت ہیں۔ آپؐ کے لئے قرآن مجید میں لفظ نور آیا ہے' بایں معنی کہ آپؐ نورِ ہدایت' شمع ہدایت اور سراجاً منیراً ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید آپؐ کو رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کتابِ متلو ہے اور نبی اکرم ﷺ قرآنِ مجسم ہیں ___ جیسا کہ آپؐ کی وفات کے بعد چند لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپؐ کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا تھا: کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنَ ___ لیکن آپؐ کے اس اُسوہ' نور اور شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی چند شرائط کو پورا کرنا لازم ہے۔ اگرچہ آپؐ اپنی جگہ شمع ہدایت ہیں اور جو چاہے آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کر لے' لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ ان شرائط کو یہاں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿لِمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ۞﴾

''ہر اُس شخص کے لئے (نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اعلیٰ وارفع نمونہ

ہے) جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔‘‘

آیت کے اس حصے میں دو چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ ایک ایمان باللہ اور دوسرا ایمان بالآخرۃ۔ ہمارے دین کے تین بنیادی ایمانیات ہیں‘ جو گویا تین Pillars of Faith ہیں۔ (۱) ایمان باللہ یا توحید (۲) ایمان بالآخرہ یا معاد‘ اور (۳) ایمان بالرسالت۔ ایمان بالرسالت سے نبی اکرمﷺ کی شخصیت کا تعلق ہے۔ یہ ایمانیاتِ ثلاثہ باہم گتھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی انسان کا اللہ پر ہی یقین نہیں یا اس میں شرک شامل ہے تو وہ نبی اکرمﷺ کی ذاتِ اقدس کو اپنے لئے نمونہ کیسے بنا لے گا! اور اگر اسے آخرت کا یقین نہیں تو پھر وہ آنحضرتﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کیسے کرے گا! یہ پہلی دو چیزیں ہوں گی تو تیسری بات کا امکان پیدا ہو گا۔ یعنی وہ شخص جو اللہ سے غافل ہو یا کبھی کبھار یا اتفاقاً اللہ کا نام لینے والا ہو‘ اور جو اللہ سے ملاقات کی حقیقی امید دل میں نہ رکھتا ہو‘ اسی طرح جس شخص کو یوم آخرت اور محاسبۂ اُخروی کی کوئی توقع نہ ہو‘ گویا جو ان دو ایمانیات سے تہی دست ہو‘ اس کے لئے آنحضرتﷺ کی سیرتِ مطہرہ اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ آنحضورﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع وہی شخص کر سکے گا جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا امیدوار بھی ہو اور جس کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہو کہ آخرت ہونے والی ہے‘ جہاں کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی بات پر ہو گا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا طرزِ عمل اور رویہ اللہ کے رسولﷺ سے کس درجے قریب تر رہا ہے۔ لہٰذا بات صاف کر دی گئی کہ:

﴿لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا۝﴾

اس پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہﷺ کی زندگی اس شخص کے لئے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی اس کا اتباع کر سکے گا اور وہی آپؐ کے نقشِ قدم پر چل سکے گا جو اللہ کا طالب ہو اور جو آخرت میں سرخروئی چاہتا ہو اور جو کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ یہاں رجاء کا جو لفظ آیا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں طالب ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے‘ اور اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہونے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے‘ جس کی وضاحت وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ سے مزید ہو گئی۔ یہاں امیدواری میں اللہ کی رحمت‘ اللہ کی شفقت‘ اللہ کی نظرِ عنایت کے جملہ مفاہیم شامل ہیں۔ جیسے سورۃ الکہف کی آیت ۲۸ میں فرمایا: ﴿اَلَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ﴾ ’’وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح و شام‘ اپنے ربّ کے چہرۂ انور کے طلبگار بن کر‘‘ — وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالبین ہیں۔

یہاں فرمایا: ﴿لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ﴾ ’’جو اللہ کی رضا کا امیدوار ہے اور جو یومِ آخرت میں سرخروئی کی توقع رکھتا ہے۔‘‘ گویا اسے یقین ہے کہ یہ دن آ کر رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلے ہو کر رہیں گے۔ ﴿وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا۝﴾ ’’اور وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو کثرت کے ساتھ۔‘‘ یعنی وہ ہر کام اور معاملے میں اللہ کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام و اہتمام کرتا ہو اور زبان و قلب سے بھی اللہ کو یاد کرتا ہو۔ وہ اس بات کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ قلب و شعور میں مستحضر رکھتا ہو کہ اسے یومِ آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی اس دُنیوی زندگی کا حساب دینا ہے۔ یہ تین شرطیں پوری ہوں گی تو اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کسی درجے عمل پیرا ہونے کا امکان پیدا ہو گا۔

اسوۂ حسنہ کی پیروی کا عملی نمونہ

اب چونکہ یہاں نبی اکرمﷺ کے اتباع کا مضمون چلا ہے تو ضرورت تھی کہ مثال پیش کر کے بتایا جائے کہ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے والوں کا رویہ کیا ہوتا ہے اور ان کے طرزِ عمل میں کیا فرق واقع ہوتا ہے! لیکن قرآن حکیم میں آپ کو یہ اسلوب عام ملے گا کہ استدلال کی کڑیوں کو بسا اوقات اس طرح نمایاں نہیں کیا جاتا جس طرح ہم نمایاں کرتے ہیں کہ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا یا یہ نکلنا چاہئے۔ جیسے ہم کہیں گے کہ نبی اکرمﷺ کے اِس اسوۂ حسنہ کی کامل مثال دیکھنی ہو تو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کو دیکھو جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات کہے بغیر اس

اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ان الفاظ میں ذکر فرما دیا گیا:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ ﴾

''اور حقیقی مؤمنوں کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس صورت حال نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔''

یہ بات گویا اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک عملی نمونہ اور مظاہرہ ہے۔

غزوۂ احزاب کے تناظر میں اصل اسوۂ رسولؐ

یہ اسوۂ حسنہ کیا ہے جس کا اس سورۃ الاحزاب میں ذکر کیا گیا ہے؟ اسے ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہوگا۔ یوں تو نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی ہر مسلمان کے لئے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہے۔ ایک باپ کے لئے آپؐ بہترین نمونہ ہیں کہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ ایک شوہر کے لئے آپؐ کامل نمونہ ہیں کہ اسے اپنے گھر میں اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ ایک پڑوسی کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک مرشد و مزکی' ہادی و داعی اور مبلغ کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک حکمران اور سربراہِ ریاست کے لئے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک منصف اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے لئے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اکمل و اتم نہ ہو۔

میں کئی مرتبہ سیرت کی تقاریر میں اپنے اس شدتِ تاثّر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے سے میں مبہوت ہو جاتا ہوں اور میرے قلب پر نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مطہرہ کا یہ گہرا تاثر ثبت ہوتا ہے کہ اس قدر جامع شخصیت تو ہمارے تصور میں بھی آنی ممکن نہیں۔ کیا زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو اسوۂ حسنہ کے اعتبار سے نامکمل و نا تمام اور خالی نظر آتا ہو! ــــــ آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہر پہلو سے مصروف ترین اور گھمبیر ترین تھی۔ ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ جو مسجد کا امام ہو وہ عموماً خطابت نہیں کرتا' خطیب علیحدہ ہونا چاہئے۔ جو خطیب صاحب ہیں وہ پانچ وقت کی نماز پڑھانے کی پابندی کیسے قبول کر لیں گے! گویا کہ امامت علیحدہ' خطابت علیحدہ۔ پھر مدرس علیحدہ۔ مزید برآں جو صاحب درس کے فرائض انجام دے رہے ہوں' عام طور پر اُن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ یہ تزکیہ و تربیت بھی کریں گے۔ اس کے لئے کہیں اور جایئے۔ یہاں سے تو علم حاصل کر لیجئے' مدرسین قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ ﷺ پڑھا دیں گے' تزکیۂ نفس کے لئے عموماً کسی دوسرے مزکی و مرشد کی تلاش کرنی ہوگی' جن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ مرحلہ طے کرنا ہوگا ــــــ پھر جو لوگ ان شعبوں سے متعلق ہیں ممکن نہیں کہ وہ آپ کو کہیں سپہ سالار بھی نظر آئیں! یا کم از کم کچھ انتظامی امور کی انجام دہی میں ہی مصروف ملیں! ایسے لوگ اگر لکھنے پڑھنے اور تدریس و تعلیم میں زندگی بھر لگے رہے یا دعوت و تبلیغ ہی میں پوری زندگی کھپا دی اور ان میدانوں میں انہوں نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا تو عموماً ایسے لوگوں کا گھر گرہستی والا کھاتہ کورا نظر آئے گا۔ معلوم ہوگا کہ ساری عمر شادی ہی نہیں کی جب کہیں جا کر یہ کام انجام دیئے ہیں۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں جو جامعیت ہے وہ پوری انسانی تاریخ حتیٰ کہ انبیاء و رُسل کی مقدس جماعت میں بھی کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ آپؐ مسجد نبوی کے پنج وقتہ امام بھی ہیں اور خطیب بھی ہیں' اصحابِؓ صفہ کے لئے مدرس و معلم بھی ہیں' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے آپ مزکی و مربی بھی ہیں۔ آپؐ ہی سپہ سالار بھی ہیں۔ صلح کی گفتگو ہو رہی ہے تو آپؐ ہی کر رہے ہیں۔ باہر سے جو وفود آ رہے ہیں تو ان سے آپؐ ہی معاملہ کر رہے ہیں۔ مقدمات و تنازعات ہیں تو وہ آپؐ کی عدالت میں پیش ہو رہے ہیں۔ تصور تو کیجئے کہ کون سا میدان اور کون سا پہلو ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ ہمیں حضور ﷺ کی زندگی میں نمونہ نہیں مل سکتا؟ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کا جائزہ لیجئے ــــــ بغیر کسی تنقیص کے میں یہ عرض کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں کسی نبی کی توہین کروں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک باپ کے لئے ان کی زندگی میں کوئی

نمونہ نہیں' ایک شوہر کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ کسی قاضی' کسی سپہ سالار' کسی فاتح اور کسی صدرِ ریاست کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ آنجنابؐ ایک درویش' ایک مبلغ اور ایک مربی ومزکی کی حیثیت سے تو ایک مکمل نمونہ ہیں' لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اور پہلو خالی نظر آ رہے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب وذہن اور شعور وادراک پر جس چیز کا گہرا تاثر ہے وہ آنحضورﷺ کی حیاتِ طیبہ کی اسی جامعیت کا ہے۔ میں جب گردوپیش کا جائزہ لیتا ہوں اور حالات کو خود اپنے اوپر وارد کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم ایک ذمہ داری کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے اور اسے نباہ نہیں پاتے' جبکہ وہاں کیا عالم ہے! کون سی ذمہ داری ہے جو نہیں اٹھائی ہوئی ہے اور اس کو کماحقہٗ پورا نہیں کیا ہے! کون سی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو! الغرض نبی اکرمﷺ کا اسوۂ حسنہ ہر اعتبار' ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اکمل واتم ہے ـــــ حضورﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو اللہ کا نازل کردہ قرآن حکیم ہے اور دوسرا عظیم معجزہ خود نبی اکرمﷺ کی اپنی ذات اور شخصیت ہے اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے اس قدر گھمبیر اور اتنی ہمہ گیر زندگی گزاری ہے کہ ہمارے ہوش اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں آتی ـــــ یہ بھی خاصہ نبوت ہے اور یہ صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرمﷺ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے اعتبار سے ایک اسوۂ کامل ہیں۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن مجید میں جب یہ لفظ ''اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ'' آیا ہے تو کس سیاق وسباق اور سلسلۂ عبارت (context) میں آیا ہے اور اس حوالے سے آپؐ کا اصل اور خصوصی اُسوہ کون سا ہے! ـــــ یہ اسوۂ حسنہ وہ ہے جو ہمیں غزوۂ احزاب میں نظر آتا ہے۔ وہ صبر وثبات' اللہ کے دین کے لئے سرفروشی و جان فشانی کہ جان نثاروں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہر مشقت میں آپؐ بھی شریک تھے۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اٹھائی ہو اور آپؐ نے نہ اٹھائی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ کہیں زرنگار خیمہ علیحدہ لگا دیا گیا ہو' جہاں قالین بچھا دیئے گئے ہوں اور وہاں حضورﷺ آرام فرما رہے ہوں اور مورچھل جھلے جا رہے ہوں' جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم خندق کھودنے کے لئے کدالیں چلا رہے ہوں۔ بلکہ معاملہ یہ تھا کہ خندق کھودنے والوں میں آپﷺ بھی شامل ہیں۔ کدالیں چلاتے ہوئے صحابہ کرامؓ بیک آواز کہہ رہے ہیں: اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ اور نبی اکرمﷺ ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر فرما رہے ہیں: فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ ۔ یعنی سردی اور بھوک کی تکالیف اٹھانے میں آپؐ برابر کے شریک ہیں۔ اس خیال سے کہ بھوک اور نقاہت سے کہیں کمر دہری نہ ہو جائے' صحابہ کرامؓ نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ ایک صحابیؓ حضورﷺ کو اپنے پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں۔ اس پر سرورِ عالم' محبوب ربّ العالمین' خاتم النبیین والمرسلینﷺ اپنا کرتا اٹھاتے ہیں تو اُن صحابیؓ کو شکم مبارک پر دو پتھر بندھے نظر آتے ہیں۔ محاصرے کے دوران آپﷺ ہر وقت وہاں موجود رہے اور جس طرح صحابہ کرامؓ تکان سے چور ہو کر پتھر کا تکیہ بنا کر تھوڑی دیر کے لئے آرام کی خاطر لیٹ جاتے تھے' اسی طرح حضورﷺ بھی وہیں کھلی زمین پر کچھ دیر کے لئے پتھر پر سر رکھ کر آرام فرما لیا کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ آپﷺ نے استراحت کے لئے اپنے واسطے کوئی خصوصی اہتمام فرمایا ہو ـــ بنی قریظہ کی غدّاری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے اہل وعیال مبتلا تھے' اسی سے آپؐ کے اہل بیت بھی دوچار تھے۔ اپنے لئے یا اپنے اہل وعیال کے لئے آپؐ نے حفاظت کا کوئی خصوصی انتظام نہیں کیا تھا۔

یہ ہے اصل صورتِ واقعہ اور صورتِ حال' جس میں فرمایا گیا کہ: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ـــــ اور ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کی پیروی کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل پیرا ہیں! ویسے تو ہر چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی وقیع اور لائق اتباع ہے۔ لیکن اگر یہ چھوٹی سنتیں اس اصل اور بڑے اسوہ کے لئے اوٹ بن جائیں تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ ان چھوٹی سنتوں پر عمل کرنے کے باعث کسی کو یہ مغالطہ اور فریب ہو سکتا ہے کہ ''میں بڑا متبعِ سنت ہوں۔ میں

نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے' لباس میں بھی میں سنت کو پیش نظر رکھتا ہوں۔ میں نے یہ بھی اہتمام کر رکھا ہے اور وہ بھی اہتمام کر رکھا ہے''۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسوہ بھی زندگی میں ہے یا نہیں جو سورۃ الاحزاب میں بیان ہوا ہے! دعوت وتبلیغ اور اقامت واظہار دین الحق کے لئے سرفروشی' جاں فشانی اور عملی جدوجہد اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات' تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنا ___ اگر زندگی میں یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر تو درحقیقت یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آڑ بن گئی ہیں۔ اس تل کے پیچھے پہاڑ اوٹ میں آچکا ہے۔ اور ہمارا اِس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل ''اسوہ'' ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے (الا ماشاء اللہ) اور وہ اسوہ یہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور غزوۂ احزاب کے حالات کے بیان میں قرآن حکیم اس کی طرف مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصی طور پر مرتکز (focus) کرتا ہے۔

امتحان وآزمائش میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

پھر اس اسوۂ حسنہ کا جو ٹھپا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و کردار پر لگا ہے اور اس کی جو چھاپ ان کی زندگیوں میں آئی ہے وہ یہ ہے: ﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ جیسے کوئی مشین یا پریس ہو' اس میں لوہے کے ٹکڑے یا کاغذ رکھے ہوں تو جو ڈائی یا بلاک اس میں فٹ ہے' اسی کا نقش (impression) ان پر آتا چلا جائے گا۔ اسی طرح یہ اس ''اُسوۂ حسنہ'' کا نقش ہے جو صحابہ کرام ؓ نے قبول کیا ___ ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کا مجموعہ بنا کر اسے ہی کل ''اُسوہ'' سمجھ بیٹھے ہیں اور ہمارا حال (الا ماشاء اللہ) یہ ہو گیا ہے کہ مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں۔ یہ وہ تمثیل ہے جو علمائے یہود کے اس طرزِ عمل پر حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی کہ مہماتِ دین اور مقتضیاتِ دین کی طرف سے تو انہوں نے آنکھیں بالکل پھیر لی تھیں یا بند کر رکھی تھیں اور جزئیات وفروعات کو وہ کُل دین سمجھ بیٹھے تھے اور اسی کی تدریس وتعلیم میں مصروف رہتے تھے اور اس ضمن میں ذرا سی کمی بیشی پر لوگوں کو سرزنش بھی کرتے تھے اور ان کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کی بیان کردہ یہ تمثیل دنیا کے ہر کلاسیکل ادب میں ہمیشہ ہمیش کے لئے ضرب المثل بن گئی ہے ___ میں پھر عرض کر دوں کہ خدارا میری اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کی تحقیر کر رہا ہوں یا ان کی اہمیت گھٹا رہا ہوں' معاذ اللہ! نبی اکرم ﷺ کی ہر سنت' چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو' واجب الاتباع ہے۔ ان سنتوں کا اہتمام والتزام اگر اس ''اُسوہ'' کے ساتھ ہو جو اِس سورۂ مبارکہ کے مطالعے کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا ہے تو سونا ہے' اس کے بغیر ہو تو تانبا ہے' جس کی سونے کے مقابلے میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس لئے کہ اگر نسبت وتناسب درست نہیں ہو گا تو صحیح نتیجہ کیسے برآمد ہو گا! پھر تو وہی طرزِ عمل وجود میں آئے گا جو میں حضرت مسیحؑ کی تمثیل کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں۔

اس ''اُسوہ'' کی چھاپ صحابہ کرامؓ کی شخصیتوں پر جو پڑی تو کیفیت یہ ہو گئی کہ جب انہوں نے ان لشکروں کو دیکھا جو اُمڈ اُمڈ کر اِدھر سے بھی آ رہے تھے اور اُدھر سے بھی آ رہے تھے تو وہ خوفزدہ نہیں ہوئے' بلکہ وہ کہنے لگے کہ یہ حالات تو پیش آنے والے تھے' جن کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے وعدہ کیا تھا۔ خیبر سے کیل کانٹے سے لیس یہودیوں کے لشکر بھی آ گئے۔ مکہ سے ابوسفیان ایک لشکر جرار لے کر آ گئے۔ مشرق سے غطفان کے قبائل آ گئے۔ آیت نمبر ۱۰ میں ان تمام حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴾ ''یہ وہ وقت تھا جب اہل ایمان خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے''۔ یہ نہایت کڑا امتحان تھا صحابہ کرام ؓ کے صبر وثبات کا۔ یہ آزمائش تھی ان کی استقامت اور استقلال کی! سردی کا موسم تھا۔ پھر ہر چہار طرف سے حملہ آوروں کے لشکر پر لشکر جمع ہو گئے تھے جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مسلمان خندق کے اِس پار محصور تھے۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ برابر خبریں مل رہی تھیں کہ مدینہ کے باہر جنوب مغرب میں بنوقریظہ کا جو یہودی قبیلہ آباد تھا اور جس سے معاہدہ تھا

کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے' وہ ساتھ دینے کے بجائے نقضِ عہد پر تلے بیٹھے ہیں' اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ پیچھے سے کب مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں' جہاں نہ صرف دفاع کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ مدینہ میں صرف خواتین اور بچے موجود تھے۔ ان حالات میں اہلِ ایمان کی کیفیات کیا تھیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکلے! یہ کہ:

﴿قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾

''انہوں نے کہا کہ اسی کا تو وعدہ کیا تھا اللہ نے اور اس کے رسول (ﷺ) نے' اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔''

امتحان و آزمائش ــــ اللہ تعالیٰ کی سنت ثابتہ

تعین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان مؤمنین صادقین کے اس قول کے وقت قرآن مجید کا کون سا مقام اور کون سی آیت ان کے سامنے ہوگی ــــ ویسے قرآن حکیم میں یہ مضمون مختلف اسالیب سے بار بار آیا ہے کہ ہم اہل ایمان کا امتحان لیتے ہیں' ہم انہیں آزماتے ہیں' ہم ایمان کے دعوے داروں کو آزمائیں گے۔ سورۃ العنکبوت' جو مکی سورت ہے' اس کے پہلے رکوع میں یہ مضمون خوب واضح طور پر آیا ہے اور یہ رکوع ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ فرمایا:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝﴾ (آیات ۲'۳)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!''

پھر سورۃ البقرۃ جو مدنی سورت ہے' کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط﴾

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟''

معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات کے ذریعے آزمائش و امتحان سے گزارنے کی اس سنت ثابتہ سے اہل ایمان کو بہت پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو آزمائش و ابتلاء کی بھٹیوں سے گزارا جائے گا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا جائے ــــ البتہ میرے خیال میں **هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ** کے پس منظر میں سورۃ البقرۃ کی یہ آیات آتی ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ لا قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ (آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷)

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف و خطر' تنگی' فاقہ کشی اور جان و مال اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے' انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے ربّ کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی' اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی' اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کی کیفیات سے ان آیات کے ذریعے اہل ایمان کو پیشگی مطلع کر دیا گیا تھا۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کے پس منظر میں یہ آیات بہت نمایاں ہیں۔ اہل ایمان کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ شعوری طور پر جانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے کہ سخت سے سخت آزمائشیں' امتحانات اور ابتلاءات

آنے والے ہیں۔

میں سیرتِ مطہرہ کی تقاریر میں یہ بات کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر ''یومِ طائف'' نبی اکرم ﷺ کے لئے سب سے کٹھن اور سب سے سخت دن تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب دریافت کیا کہ آپؐ پر یومِ اُحد سے زیادہ کوئی سخت دن گزرا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ ''ہاں' مجھ پر جو سخت ترین دن گزرا ہے وہ یومِ طائف تھا''۔ چنانچہ شخصی اعتبار سے حضور کے لئے یوم طائف ابتلاء و آزمائش کا نقطۂ عروج (climax) ہے' جبکہ بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کے لئے غزوۂ احزاب آزمائش کی چوٹی ہے ــــــ جس کا نقشہ پچھلے رکوع میں یوں کھینچا گیا ہے کہ: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ــــــ غور کیجئے کہ یہاں بھی وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آخری امتحان یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے متعلق وارد ہوا ہے کہ ﴿وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۰۴۔۱۰۶) میں سمجھتا ہوں کہ ''شاباش'' کا اس سے بہتر اسلوب ممکن نہیں ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان فی الواقع سخت تھا۔ وہی انداز اور اسلوب یہاں ہے کہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ــــــ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ ہم نے اہلِ ایمان کا کٹھن امتحان لے لیا اور ان کو خوب جھنجوڑ لیا۔

جب اہل ایمان اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم نکلے تو دشمنانِ دین کے جو لشکر بادلوں کی طرح اُمڈ کر آئے تھے وہ ایسے چھٹ گئے جیسے تھے ہی نہیں۔ غزوۂ احد میں تو ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے لیکن یہاں کھلے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ ایک دو مرتبہ خندق میں کود جانے والے کفار سے کچھ مبارزتیں ہوئیں اور تیر اندازی سے چند صحابہؓ شہید ہوئے جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں۔ اس غزوے میں باقاعدہ کھلا مقابلہ تو ہوا ہی نہیں۔ البتہ محاصرہ بڑا شدید اور خطرہ بڑا مہیب تھا کہ محاصرے کی طوالت' دشمنانانِ اسلام کے لشکر کی تعداد' پھر سردی کا عالم اور سامانِ خورد و نوش کی قلت کی وجہ سے خندق میں موجود صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا' جس کا نقشہ آیت نمبر ۱۰ میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے کہ: ﴿وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ ''جب خوف کی وجہ سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے مُنہ کو آنے لگے۔'' تو اِن حالات میں مؤمنینِ صادقین کی دلی کیفیات اور ان کے صبر و ثبات کا نقشہ اس آیت میں ہمارے سامنے یہ آیا کہ:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝﴾ (آیت ۲۲)

''اور حقیقی اہل ایمان کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس واقعہ نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیات میں مزید اضافہ کر دیا۔''

اس کے برعکس منافقین اور وہ لوگ جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے' ان کا کیا حال تھا؟ فوری تقابل کے لئے ان کی دلی کیفیات سے متعلق آیات بھی دیکھ لیجئے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ۝ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ۝﴾ (آیات ۱۲ تا ۱۵)

''اور یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے' پلٹ چلو۔ جب ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے

میں ہیں، حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے، دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تأمل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کی باز پُرس تو ہونی ہی تھی"۔

اس امتحان و آزمائش کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین اور مؤمنین صادقین علیحدہ علیحدہ نمایاں ہوگئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر جو منافقین راستے ہی سے پلٹ گئے تھے انہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو وہ ہرگز پیٹھ نہ پھیریں گے۔ غزوۂ خندق میں جب اُحد سے بھی بڑا خطرہ سامنے آیا تو ان منافقین کا پول کھل گیا اور واضح ہوگیا کہ یہ لوگ اپنے اس عہد میں کتنے مخلص اور سچے تھے۔

غزوۂ احزاب میں نصرتِ الٰہی کی آمد

جب امتحان مکمل ہوگیا اور مؤمنینِ صادقین اور منافقین بھی چھٹ کر نمایاں ہوگئے تو نصرتِ الٰہی آ گئی اور ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسے نادیدہ لشکر اتارے جنہوں نے دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی۔ مزید برآں اپنی غیبی تائید سے کچھ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان حملہ آوروں کو اِسی میں عافیت نظر آئی کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلتے بنے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اذۡکُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ جَآءَتۡکُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ رِیۡحًا وَّجُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ؕ وَکَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرًا ۚ﴾ (آیت ۹)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر □ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔"

رات کو پورا لشکر موجود تھا، صبح دیکھا تو میدان خالی پڑا تھا۔ رات کی شدید آندھی نے ان لشکروں کے خیموں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور نظر نہ آنے والی فوجوں نے کھلبلی مچا دی، جس کے نتیجے میں تمام حملہ آور لشکر صبح طلوع ہونے سے پہلے اپنا بوریا بستر گول کر کے کوچ کر گئے۔ "نظر نہ آنے والی فوجوں" سے مراد وہ مخفی قوتیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وہ فرشتے ہیں جو اِس کائنات کے نظام اور انسانی معاملات میں اللہ کے حکم سے کام کرتے رہتے ہیں اور انسان ان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ بہرحال اس تمام صورت حال کی غرض و غایت دراصل آزمائش و امتحان تھی، جس میں مخلص اہل ایمان پورے اترے اور انہوں نے منافقین کے قول ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا﴾ کے برعکس دلی یقین کے ساتھ یہ کہا کہ: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ﴾ ــــ اس ابتلاء سے نہ وہ ہراساں اور خوف زدہ ہوئے اور نہ ہی ان کے حوصلے پست ہوئے، بلکہ ان کی کیفیات یہ تھیں کہ: ﴿وَمَا زَادَهُمۡ اِلَّاۤ اِیۡمَانًا وَّتَسۡلِیۡمًا ۚ﴾ یعنی اس پوری صورتِ حال نے ان کے ایمان اور ان کی تسلیم و رضا کی کیفیات کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور وہ پورے قلبی اطمینان اور انبساطِ قلب کے ساتھ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں "زَادَ" کا فاعل دراصل وہ پوری صورت حال ہے جو غزوۂ احزاب میں پیش آئی۔

ایمان میں کمی بیشی ــــ امام اعظمؒ اور امام بخاریؒ کا موقف

اب دیکھئے کہ یہ آیت اس بات کے لئے بھی نص ہوگئی کہ ایمانِ حقیقی بڑھتا بھی ہے۔ یہاں کسی ابہام کے بغیر فرمایا گیا ہے کہ اس صورتِ واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤمنین صادقین کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا۔ ان کی جو کیفیتِ تسلیم و رضا تھی، وہ بھی بڑھ گئی ــــ اور ان کا رویہ یہ ہوگیا کہ ؏ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"۔ ایمان میں اضافے کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۳ میں بھی غزوۂ اُحد پر تبصرے کے دوران آیا ہے کہ: ﴿اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ

فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ ''(وہ مؤمنین صادقین) جن سے لوگوں (مراد ہیں منافقین) نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑا لشکر آیا ہے لہٰذا ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا''۔ یہاں ''زَادَهُمْ'' ایمانِ حقیقی اور کامل سپردگی میں اضافے کے لئے آیا ہے۔ لہٰذا ازروئے قرآن ایمانِ حقیقی کے بڑھنے کی نصوص ہمارے سامنے آ گئیں ـــــ اور جو چیز بڑھ سکتی ہے' وہ گھٹ بھی سکتی ہے۔

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کا موضوع ہمارے منتخب نصاب میں ایمان حقیقی کے مباحث کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ یہاں میں اجمالاً وضاحت پر اکتفا کروں گا۔ درحقیقت ایک قانونی ایمان ہے جو اِس دنیا میں ہمارے ایک دوسرے کو مسلمان سمجھے جانے کا سبب یا ذریعہ بنتا ہے۔ اس قانونی ایمان میں عمل سرے سے زیر بحث□ آتا' لہٰذا یہ قانونی ایمان نہ بڑھتا ہے' نہ گھٹتا ہے۔ اس کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بالکل درست ہے کہ اَلْاِيْمَانُ قَوْلٌ لَا يَزِيْدُ وَلَا يَنْقُصُ ـــــ ''ایمان قول و قرار کا نام ہے' جو نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔'' اس ایمان کا دار و مدار اقرار باللسان پر ہے اور تصدیقِ قلبی اس میں زیرِ بحث آ ہی □ سکتی۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ□ ہے کہ کسی کے دل میں اتار کر دیکھ لیا جائے کہ ایمان حقیقی موجود ہے یا □! اور کوئی جھوٹ موٹ کلمہ پڑھ رہا ہے یا سچ پڑھ رہا ہے؟ یہ قانونی ایمان کسی شخص کے اسلامی معاشرے کا فرد اور کسی اسلامی ریاست کا شہری بننے کی بنیاد بنتا ہے اور یہ ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ جبکہ ایک ہے ایمانِ قلبی' یعنی ''تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ'' والا ایمان' جو دل میں ہوتا ہے۔ قانون اس سے بحث□ کرتا' لیکن آخرت میں ساری بحث اسی سے ہو گی۔ اللہ کو کسی کے قانونی مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پرواہ□ ہے' یہ دُنیوی معاملہ ہے' دنیا میں اس بنیاد پر معاملات طے ہو چکے۔ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں پر ہے کہ یہاں ایمان و یقین ہے یا □! ـــــ اس ضمن میں سورۃ الحجرات میں فرمایا کہ: ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل□ ہوا ہے''۔ قلبی اور حقیقی ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ اس دل والے ایمان میں ''عمل'' ایک جزوِ لازم بن جائے گا۔ اس لئے کہ دل میں یقین ہو گا تو عمل میں اس کا ظہور لازماً ہو گا۔ اس اعتبار سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول صد فی صد درست ہے کہ: اَلْاِيْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ يَزِيْدُ وَيَنْقُصُ ۔ یعنی ایمان قول و عمل کے مجموعے کا نام ہے' یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔ یہ ضمنی بحث ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿﴾ کے ضمن میں آ گئی۔ ''اور اس چیز نے □ بڑھایا ان میں مگر ایمان اور تسلیم کو''۔

یہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے جو ایک قلبی کیفیت ہے۔ اور ''تسلیم'' سے مراد ہے سپردگی و حوالگی۔ اسلام اور تسلیم میں کوئی خاص فرق □ ہے۔ اسلام بابِ افعال ہے اور تسلیم باب تفعیل ہے۔ بابِ افعال کا خاصہ ہے کہ کوئی کام ایک دم ہو جائے' لہٰذا اسلام کا مطلب ہو گا فوری طور پر خود کو کسی کی سپردگی میں دے دینا اور باب تفعیل کسی کام کے پے در پے اور مسلسل ہونے کی خاصیت کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ تسلیم کا مفہوم ہو گا ہر دم' ہر وقت اور مسلسل اس سپردگی کی کیفیت کو قائم و برقرار رکھنا۔ جیسے ہی کسی نے اقرار کیا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وہ دفعتہً کفر کی سرحد سے اسلام کی سرحد میں آ گیا۔ اس نے ایک پالے سے دوسرے پالے میں یکایک چھلانگ لگا دی اور وہ مسلمان ہو کر مسلم معاشرے کا فرد اور ایک مسلم ریاست کا شہری بن گیا۔ اس کو ایک مسلمان کے تمام حقوق حاصل ہو گئے۔ اور یہ بالکل برابر ہوں گے' ان میں کوئی کمی بیشی اس دنیا میں نہیں ہو گی۔ اسلام کی اس کیفیت کو وثوق حاصل ہو جائے گا اور اس کے طرزِ عمل میں مسلسل اطاعت شعاری اور فرماں برداری اور سپردگی کا مظاہرہ ہوتا رہے گا۔ تو یہ تسلیم ہے۔ یہ مصرعہ اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے کہ ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اور فارسی کا یہ شعر بھی اسی کیفیت کا مصداق ہے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

جواں مرد اہل ایمان کا ایفائے عہد

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾

”اہل ایمان میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی (اپنی باری آنے کا) منتظر ہے۔ اور انہوں نے (اپنے رویئے اور طرزِ عمل میں) کوئی تبدیلی نہیں کی“۔

کاش اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں شامل فرما دے!

یہ آیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر غزوۂ احزاب کے پس منظر میں غور و تدبر کیا جائے ـــــ اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان کی مدح وستائش فرما رہا ہے کہ ان میں ایسے بھی جواں مرد اور باہمت لوگ ہیں جو اپنے عہد کو پورا کر چکے۔ یہاں رِجَالٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو رَجُلٌ کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین اس سے خارج ہو گئیں۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان کو بالعموم مذکر کے صیغے میں خطاب کیا گیا ہے۔ ایسا بغرضِ تغلیب ہوتا ہے اور اس میں آپ سے آپ خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہاں لفظ ”رِجَـــــال“ اپنی اس معنویت کے لئے آیا ہے کہ اس دنیا میں شیطانی وساوس سے بچ کر دین پر کاربند رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ بڑی ہمت اور جواں مردی کا کام ہے۔ یہی مضمون سورۃ النور کے پانچویں رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ (آیت ۳۷)

”ان میں ایسے باہمت وجواں مرد بھی ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل □ کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی“۔

اس کا معنی یہ □ ہے کہ یہ کیفیات عورتوں میں □ ہو سکتیں۔ خواتین میں صحابیات ہیں، اُمہات المؤمنین ہیں، رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین۔ پھر بڑی بڑی متقی، صالح، صابر، عابد وزاہد اور مجاہد خواتین اُمت میں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں ایک اللہ والی خاتون حضرت خنساء (رضی اللہ عنہا) بھی ہیں، جن کے چار جوان بیٹے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایران کی جنگ قادسیہ میں شہید ہو گئے اور انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ ایک خاتون وہ بھی ہیں کہ جب غزوۂ اُحد میں عارضی ہزیمت ہوئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ مدینہ تک پہنچی تو وہ بے تابانہ میدانِ اُحد میں آتی ہیں۔ ان کو خبر دی جاتی ہے کہ تمہارے والد شہید ہو گئے، مگر وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا شوہر بھی شہید ہو گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ کوئی بات □، مجھے یہ بتاؤ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا۔ وہ اللہ کی بندی کہتی ہیں کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتاؤ۔ اور جب ا□ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بخیریت ہیں تو وہ کہتی ہیں: الحمد للہ! اس خوشخبری کے آگے سب کچھ ہیچ ہے ـــــ باپ، شوہر اور بیٹا تو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو کر کامران و کامیاب ہو گئے۔ الغرض ہماری تاریخ میں ایسی خواتین کی بے شمار نظائر موجود ہیں۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ ؎

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد
نہ ہر زن زن است و نہ ہر مَرد مَرد

چنانچہ اس بات کو اس مقام پر ذہن میں رکھئے کہ یہاں رجال سے جواں مرد و باہمت لوگ مراد ہیں، خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔

ان آیات سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ بندۂ مؤمن کی زندگی کے دو رُخ ہیں ـــــ ایک طرف اللہ کے ساتھ دلی تعلق اور لگاؤ اور اس میں ثبات، اور دوسری طرف اللہ کے دین کے لئے جہاد و مجاہدہ اور اس میں صبر و ثبات اور استقلال و

استقامت۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں‘ جو آیۂ برّ کے نام سے ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے‘ برو تقویٰ کی حقیقت کے ضمن میں ارشاد ہوا کہ اللہ کے نزدیک صادق اور نیک لوگ وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں‘ نماز قائم کرتے ہیں‘ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں‘ اور جب کوئی عہد و معاہدہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں‘ اور اللہ کی راہ میں تنگی اور مصیبت نیز جہاد و قتال کے موقع پر انتہائی صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں۔ ایک بندۂ مؤمن کی زندگی کے یہ دو رُخ ہیں اور ان دونوں کے اعتبار سے انتہائی صبر و استقلال کی ضرورت ہے‘ لہٰذا یہاں فرمایا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ ”اہل ایمان میں وہ جواں مرد اور باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اس عہد کو جو انہوں نے اپنے اللہ سے کیا تھا“۔

اب غور کیجئے کہ یہ عہد کون سا ہے؟ اسلام خود ایک بہت بڑا عہد ہے۔ پھر ہم نماز کی ہر رکعت میں اس کا اقرار اور اس کی تجدید کرتے ہیں کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اللہ کے ساتھ اس سے بڑا عہد ہو ہی □ سکتا کہ ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھ ہی سے طالبِ اعانت و دستگیری ہیں اور رہیں گے۔ ہم نے اپنا سب کچھ تیرے سپرد اور تیرے حوالے کر دیا ہے۔ ؏ سپردم بتو مایۂ خویش را! از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ”بلاشبہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں“۔ اب ا□ اس سودے میں پورے اتر کر دکھانا ہے۔ کہنے کو کہہ دیا‘ پڑھنے کو پڑھ لیا‘ سننے کو سن لیا‘ لیکن پورا اتر کر دکھانا قیامت ہے۔ کہنے کو تو شاعر نے بھی کہہ دیا کہ ؎

جان دی ‘ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

لیکن اس پر پورا اترنا کوئی آسان بات □ ـــ پس یہاں ان اہل ایمان کی مدح و ستائش ہو رہی ہے جنہوں نے اس آزمائش و ابتلاء میں اپنے آپ کو پورا تول کر دکھا دیا۔ لہٰذا ان کی شان میں فرمایا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ آگے فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ ”پس ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے“ یعنی اللہ کی راہ میں جان دے کر سرخرو اور سبک دوش ہو گئے ـــ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ ”اور ان میں وہ بھی ہیں جو منتظر ہیں۔“ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ کب وہ وقت آئے جب ہم اپنے اس عہد کو پورا کر کے سرخرو ہو جائیں اور اپنے شانوں پر رکھا ہوا بوجھ اتروا کر سبک دوش ہو جائیں ـــ اگر گردن کٹ گئی تو شانوں کا بوجھ اتر گیا اور سبک دوشی حاصل ہو گئی۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ سَاَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَاِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ)) (مسلم‘ کتاب الامارۃ)

”جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت طلب کرتا رہے گا تو چاہے اس کی موت بستر پر واقع ہو اللہ تعالیٰ اسے شہداء کے مراتب تک پہنچا دے گا“۔

یہ اصل میں يَنْتَظِرُ والی کیفیت کی ایک طرح کی شرح ہے۔ البتہ اس انتظار کی کیفیات اور شرائط ہوں گی ـــ قتال کا مرحلہ کیسے آئے گا جبکہ آپ نے جہاد ہی کی کوشش شروع □ کی؟ اگر آپ نے دین کے لئے محنت و مشقت کے میدان میں قدم ہی □ رکھا‘ آپ اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کرنے والی کسی تنظیم و جماعت سے وابستہ ہی □ ہوئے تو پھر قتال کا مرحلہ کہاں سے آ جائے گا جو جہاد کی آخری اور چوٹی کی منزل ہے؟ یہ مرحلہ تو اُس وقت آ سکے گا جب آپ کسی ایسی منظم دعوت اور تحریک سے عملاً وابستہ ہوں جو اقامت دین کے لئے کوشاں ہو۔ غور کیجئے ایسے صحابہ کرامؓ بھی تو ہیں جن کا ہجرت سے قبل انتقال ہو گیا‘ لیکن وہ دعوت و تبلیغ اور تکبیر ربّ میں نبی اکرم ﷺ کے دست و بازو رہے ہیں۔ اپنی جانیں‘ اپنا مال‘ اپنے اوقات‘ اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں لگاتے رہے ہیں‘ کھپاتے رہے ہیں۔ وہ اگر غزوۂ بدر یا اُحد تک پہنچ گئے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ ان کے قدم پیچھے ہٹ جاتے! اُن کا سابقہ طرزِ عمل ثابت

کرے گا کہ وہ اپنے موقف میں کتنے ثابت قدم اور سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ جو شخص قدم قدم پر پیچھے ہٹ رہا ہو اور پیسے پیسے کو سینت سینت کر رکھ رہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اگر کبھی وقت کا تقاضا ہو تو وہ جان و مال کی بازی لگا دے گا؟ ـــــ پس جو بندۂ مؤمن صدقِ دل سے شہادت کا طالب ہو اور اللہ کی راہ میں نذرِ جاں پیش کرنے کا آرزومند ہو اُس کی زندگی میں اس کے عملی مظاہرے آ کر رہیں گے۔ اگر وہ جہاد فی سبیل اللہ کی وادی میں قدم رکھ چکا ہے اور شہادت کا طلبگار بھی ہے تو وہ اس بات کی توقع رکھے کہ اگر بستر پر بھی اس کی موت آئے تو اسے مرتبۂ شہادت مل سکے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس نے کاغان کا سفر شروع کیا ہے تو اس کے لئے بابوسر پاس تک بھی پہنچنے کا امکان ہوگا۔ لیکن اگر کوئی بالاکوٹ سے آگے بڑھنے اور وادئ کاغان میں قدم رکھنے کے لئے ہی تیار نہیں تو بابوسر پاس کب آئے گا؟ بیٹھے بیٹھے بابوسر پاس کی تمنا کرتے رہنا تو سوائے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے اور کچھ نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ؏ خود را بہ فریبد کہ خدا را بہ فریبد ـــــ ایسا شخص خود اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے یا خدا کو فریب دے رہا ہے؟ ـــــ علامہ اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے کہ: ؎

خبر نہیں نام کیا ہے اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

تو اس دھوکے کے انداز میں شہادت کی تمنا نہ ہو بلکہ عمل کے ساتھ صدقِ دل سے یہ تمنا ہو تو بستر کی موت بھی ان شاء اللہ شہادت کی موت ہوگی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موت بستر پر آئی ہے جن کی زندگی ہمیشہ جنگوں کے اندر بیتی ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ آنجناب ؓ کو بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے ''سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ'' کا خطاب ملا تھا۔ لہٰذا ان کی شہادت گویا اللہ کی تلوار ٹوٹنے کے مترادف ہوتی۔ آپ ؓ کو شہادت کی موت کی بڑی تمنا تھی اور اسلام لانے کے بعد آپ ؓ کی زندگی جہاد و قتال میں گزری ہے۔ اگرچہ ان کی شہادت کی آرزو بظاہر پوری نہیں ہوئی لیکن نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا قول مبارک اور نوید کے مطابق ان کی بستر کی موت بھی شہادت کی موت ہے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ۝﴾ ''انہوں نے اپنے رویئے میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی'' ـــــ ''تَبْدِیْلًا'' یہاں مفعول مطلق کے طور پر آیا ہے اور اس میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ان اہل ایمان نے بالکلیہ اپنے عہد اور وعدے کو ایفاء کیا اور اس میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی، بلکہ اس کو پوری طرح نبھایا ـــــ اور یہ جان لیجئے کہ ہمارے اور اُس معاشرے میں بڑا بنیادی فرق یہی تھا۔ وہ عہد کے سچے تھے اور ہم عہد کرتے ہیں تو اس کا ایفاء نہیں کرتے، اس کو نبھاتے نہیں۔ ابھی عہد کریں گے اور ہاتھ میں ہاتھ دیں گے لیکن دو دن کے اندر اس کو توڑ دیں گے۔ یہ جو ہمارے کردار میں گھن لگ گیا ہے، اس کے سبب سے ہماری شخصیتیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ جبکہ اُس معاشرے کی کیفیت یہ تھی کہ ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے تو ہر چہ بادا باد، عہد کو بہرصورت ایفاء کرنا اور نبھانا ہے، پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ کردار اُس معاشرے میں ایّامِ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ اُس دور کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ جیسے اُس معاشرے میں ظہورِ اسلام سے قبل سرے سے کوئی خیر تھا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے سے بہت سے اعتبارات سے وہ معاشرہ کہیں بہتر تھا۔ ان کے ہاں اگر کوئی دشمن بھی مہمان کے طور پر مقیم ہو گیا، چاہے وہ باپ کا قاتل ہے، تو اس پر آنچ نہیں آئے گی اور اس حالت میں انتقام نہیں لیا جائے گا۔ جسے بھائی کہہ دیا اس کے لئے جان و مال سب حاضر ہے۔ جس کو پناہ دے دی ہے اس کے لئے پورے قبیلے کی مخالفت گوارا کر لی جائے گی اور اس کی مدافعت میں اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ وہاں حال یہ تھا کہ اگر کسی کی اطاعت قبول کر لی ہے تو اب اس اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کی جائے گی۔ یہ بنیادی کردار ہوتا ہے۔ ہم اِس وقت جن اسباب کی بنا پر دنیا میں ذلیل و رسوا اور پامال ہو رہے ہیں، ہمارا کوئی وقار نہیں ہے، کوئی باعزت مقام ہمیں حاصل نہیں ہے تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارا کردار پست ہو چکا ہے اور ہم، الا ماشاء اللہ، بنیادی

اخلاقیات سے بھی تہی دست ہو چکے ہیں۔ ہمارے کردار میں پختگی نہیں ہے' بلکہ انتہائی بودا پن موجود ہے۔ عہد کر کے نبھانے اور اس کو وفا کرنے کی خُو اور ارادہ نہیں ہے۔ جھوٹے وعدے ہم کرتے ہیں اور اچھے اچھے اور بڑے بڑے سمجھدار لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہیں۔ یہ ہمارے کردار کی ناپختگی اور بودے پن کا بہت بڑا سبب ہے۔

ہمارے دین میں ایفاءِ عہد کی جو اہمیت ہے اس کا تفصیل سے ذکر ہمارے منتخب نصاب میں متعدد بار آتا ہے۔ جیسے آیۂ بر (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۷) کے درس میں اہل بر و تقویٰ کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ﴾ سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع کے درس میں بیان ہوتا ہے: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا﴾ اسی طرح سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع کی آیت ۸ اور سورۃ المعارج کے پہلے رکوع کی آیت ۳۲ میں ایک شوشے کے فرق کے بغیر امانت اور عہد کے متعلق مؤمنینِ صالحین کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پوری طرح حفاظت کرنے والے ہیں'' (وہی فلاح یافتہ ہیں) ــــ یہ ہے کردار کی اہم ترین بنیاد کہ اہل ایمان اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار کو وفا کرنے والے اور ان کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں۔

ان مؤمنین صادقین کی اس استقامت و مصابرت کا جو نتیجہ نکلا اس کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾ ''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے''۔ یہاں لام' لامِ عاقبت ہے' یعنی کسی کام کا جو نتیجہ نکلتا ہے' اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس صورت حال کے متعلق آپ کو بتایا تھا کہ یہ کڑا امتحان اس لئے لیا گیا تھا کہ جدا کر کے اور نمایاں کر کے دکھا دیا جائے کہ کون لوگ مؤمنینِ صادقین ہیں' کون لوگ ضعفِ ایمان میں مبتلا ہیں اور کون لوگ منافقین ہیں! یہی تو تمیز کرنی تھی' اور یہ تمیز اس لئے تھی کہ ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾

دین میں 'صدق' کا مقام و مرتبہ

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ہمارے دین میں صدق کا کیا مقام اور مرتبہ ہے۔ آیۂ بر میں نیکوکاروں کے متعدد اوصاف بیان کر کے آخر میں فرمایا گیا:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

''(حقیقی نیکوکار تو وہ لوگ ہیں) جو تنگی اور مصیبت کے وقت اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کرنے والے ہوں' یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں' اور یہی لوگ درحقیقت متقی ہیں۔''

سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۹ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔''

صدّیقین کے اوصاف میں سے چوٹی کے دو اوصاف یہ ہیں کہ وہ ہر حال میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے اور مصیبت و ابتلاء میں اور میدانِ قتال و وَغا میں استقامت و مصابرت کا مظاہرہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لئے سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں مُنعَم علیہم کی فہرست میں نبیّین کے بعد صدّیقین ہی کا رتبہ اور مقام بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ﴾

''جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔''

اس صدق کی بنیاد یہی ہے کہ قول میں سچے ہوں' وعدوں میں سچے ہوں' عمل میں سچے ہوں ــــ اگر راست گفتاری نہیں ہے' راست بازی نہیں ہے' راست کرداری نہیں ہے تو نہ تقویٰ ہے اور نہ نیکی ہے۔ اس کے بغیر دین کا ڈھانچہ بے جان اور غیر مؤثر ہو جاتا

ہے۔ ایسا معاشرہ بے وقعت و بے روح ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاشرے کے افراد صرف نمائشی پہلوان ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی دین محض بطورِ نمائش شامل ہے' اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ معاشرہ صدق کی دولت سے تہی دامن اور تہی دست ہے۔ یہ پونجی اور یہ سرمایہ اس کے پاس سے نکل چکا ہے اور اس پہلو سے وہ بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ' کچھ لوگ ہوں گے جن کے پاس کچھ پونجی موجود ہو۔ حالانکہ ہمارے دین کا شدید ترین مطالبہ یہ ہے کہ جو کہہ رہے ہو اُس کو عمل سے سچ کر دکھاؤ' جو تمہارے اندر ہے وہی باہر لاؤ۔ چنانچہ سورۃ الصّف میں' جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے' دوٹوک انداز میں فرما دیا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۞ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۞ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۞﴾

''اے اہلِ ایمان! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ حرکت سخت ناپسندیدہ اور بیزار کن (اور اس کے غضب کا باعث) ہے کہ تم وہ بات کہو جس کے مطابق تمہارا عمل نہیں۔ اللہ کو تو وہ اہلِ ایمان محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر مقابلہ کرتے ہیں جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

یہ ہے دراصل صدق کی بنیاد ـــــ صدق قول کا بھی ہے' صدق عمل کا بھی ہے' صدق انسان کی سیرت و کردار کا بھی ہے۔ صدق بوقت ضرورت اللہ کی راہ میں نقد جان کا نذرانہ پیش کرنا بھی ہے۔ اب ان آیات میں صدق کی اہمیت دیکھئے۔ فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۞ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۞﴾

''اہلِ ایمان میں وہ باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری کا منتظر ہے۔ (یہ اس لئے ہوا) تاکہ اللہ مؤمنین صادقین کو ان کی سچائی کی جزا دے۔ اور منافقین کو اگر چاہے تو سزا دے یا اگر چاہے تو (ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے اور) ان کی توبہ قبول فرمالے۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے''۔

منافقین کے بارے میں تدریجی احکام

غزوۂ احزاب ۵ ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ زمانہ مدنی دور کا وسط ہے۔ منافقین کے باب میں آپ کو قرآن مجید میں یہ تدریج نظر آئے گی کہ شروع میں یعنی سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران میں لفظ نفاق آیا ہی نہیں۔ صرف اس مرضِ نفاق کی علامات ظاہر کی گئیں۔ سورۃ النساء میں لفظ نفاق کے ساتھ سخت لہجہ اور اسلوب میں گفتگو شروع ہوتی ہے۔ یہاں یہ معاملہ ہے کہ منافقین کا کردار تو واضح اور نمایاں طور پر بیان کر دیا گیا ہے' لیکن ان کے رویئے کے متعلق آخری فیصلہ ابھی نہیں سنایا گیا تاکہ اگر کسی کے اندر اصلاح پذیری کا کوئی مادہ اور رمق موجود ہے تو وہ اصلاح کر لے۔ کوئی اگر نفاق کی حالت سے لوٹ سکتا ہے تو لوٹ آئے۔ کوئی اگر ایمانِ حقیقی کی طرف رجوع کر سکتا ہے تو کر لے' دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ لیکن آگے جا کر اس ضمن میں آخری احکام اور فیصلے آئے ہیں' جن میں سے ایک فیصلہ تو سورۃ النساء میں شامل کیا گیا کہ: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۞﴾ (آیت ۱۴۵) ''یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے' اور تم کسی کو اُن کا مددگار نہ پاؤ گے''۔ اور سورۃ التوبہ (البراءۃ) میں جو ۹ ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی' مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے ان منافقین کی اصل حقیقت کھول کر یہ فیصلے صادر فرما دیئے گئے کہ:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِيَ

حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿ (آیت ۶۸)

’’منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کے لئے اللہ نے آتشِ دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لئے موزوں ٹھکانہ ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے قائم و دائم رہنے والا عذاب ہے۔‘‘

آگے یہاں تک فرما دیا کہ:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ (آیت ۸۰)

’’(اے نبیؐ!) آپ خواہ ایسے لوگوں کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں، اگر آپؐ ستر بار بھی ان کو معاف کر دینے کی درخواست کریں گے تب بھی اللہ ا□ ہرگز معاف□ کرے گا، اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے، اور اللہ فاسقوں کو راہ یاب□ فرماتا۔‘‘

حضورﷺ کا اپنا مزاج ہے۔ آپؐ رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی۔ لہٰذا آپ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ستر سے زیادہ بار استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں کرتا ـــــ نبی اکرمﷺ کے اس قول کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ یہاں ستر سے مراد عدد یا ہندسہ□ ہے بلکہ یہ ایک استعارہ ہے۔ یہاں ستر کا لفظ کثرت کے لئے آیا ہے کہ اب ان کے لئے توبہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ ان کو بار بار متوجہ کیا گیا۔ تقریباً دس سال بیت گئے۔ ان کو اصلاح کا پورا پورا موقع دیا گیا ـــــ اس مقام پر ہی دیکھ لیجئے کتنے پیارے انداز میں فرمایا گیا: ﴿وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ مؤمنینِ صادقین کے لئے تو قطعیت کے ساتھ فرمایا گیا: ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ ﴾ لیکن منافقین کے لئے توبہ کرنے اور اپنے رویئے کی اصلاح کرنے کا موقع رکھا گیا اور ان کو مہلت دی گئی کہ ابھی ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلے کا وقت□ آیا ہے، ابھی ان کے لئے راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔ چونکہ ان کے لئے توبہ کا دروازہ ابھی کھلا رکھا گیا تھا لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت غفوریت اور رحمانیت کا بیان فرما دیا تاکہ منافقین بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ گویا ان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ، لوٹو اور رجوع کرو ؎

باز آ باز آ آں ہرچہ ہستی باز آ ۔۔۔ گر کافر و گبر و بُت پرستی باز آ!
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست ۔۔۔ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب آگے چلئے۔ فرمایا: ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ﴾ ’’اور اللہ نے کفار کا مُنہ پھیر دیا اور وہ اپنے دل کی جلن اور غصہ وغیظ لئے یونہی پلٹ گئے اور ان کو کوئی فائدہ حاصل□ ہوا‘‘۔ غور کیجئے کہ ان کفار کو کن کن حسرتوں کا مُنہ دیکھنا پڑا ہوگا۔ کیسے کیسے ساز و سامان کے ساتھ اور کیسی کیسی سازشوں کے نتیجے میں اتنی مختلف سمتوں سے لشکروں کا ایک جگہ آ کر جمع ہو جانا! اس کے لئے انہوں نے کیا کیا کھکھیڑ مول نہیں لئے ہوں گے؟ کتنی سفارتی بھاگ دوڑ اور چلت پھرت ہوئی ہوگی۔ کتنے ایلچی آئے اور گئے ہوں گے۔ کتنے پروگرام بنے ہوں گے! وہ کوئی ٹیلی کمیونیکیشن کا دور تو نہیں تھا۔ اُس زمانے کے عرب میں اس حملے کی تیاری اور پروگرام بنانے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے گئے ہوں گے، ذرا ان کا تصور تو کیجئے! لیکن ان کے متحدہ محاذ اور اُن کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خیمے اکھاڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر ان کے دلوں میں غیظ و غضب کی جو آگ سلگ رہی تھی اس پر اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہا ہے: ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو اُن کے غیظ و غضب سمیت لوٹا دیا، اب وہ اس میں سلگیں اور جلیں، گویا ان کے دل آگ کی بھٹی بنا دیئے گئے ـــــ وہ کوئی خیر نہ پا سکے، کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اور کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بغیر اس کے کہ اپنے مقاصد میں سے کچھ بھی انہیں ملا ہوتا، وہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر لوٹا دیئے گئے۔

اسی آیت میں آگے فرمایا: ﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ ﴾ ’’اور اللہ کافی ہو گیا اہلِ ایمان کی طرف سے قتال کے لئے۔‘‘ قتال کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ خندق میں

جو کوئی بھی کودا مبارزت طلبی کے بعد واصل جہنم ہوا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا! سیرتِ مطہرہ کی کتب میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے پوری کوشش کی تھی لیکن انہیں خندق میں لشکر اتارنے کی ہمت نہیں ہوئی‘ کیونکہ مسلمان تیراندازوں نے اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ان کو ہزیمت پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا اس غزوے میں دوبدو گھمسان کی جنگ‘ جیسے بدر اور اُحد میں ہوئی‘ کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ یہ جنگ تو اللہ نے مسلمانوں کے لئے جیت لی۔ اصل میں تو مسلمانوں کا امتحان مقصود تھا‘ وہ ہو گیا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو گیا‘ یعنی اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق جدا جدا ہو کر نمایاں اور ممیّز ہو گئے۔ بس یہی مطلوب تھا۔ اب کفار کے لشکروں کے مُنہ موڑنے کے لئے اللہ کافی ہو گیا۔

یہ آیت مبارکہ اس پُر جلال و پُر ہیبت اسلوب سے ختم ہوتی ہے کہ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا﴾ ”اللہ بڑی قوت والا‘ زبردست ہے“۔ اس سے پہلے کی آیت میں درِتوبہ وا رکھا گیا تھا لہٰذا وہاں صفات کون سی آئیں؟ ﴿غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ آیات کے آخر میں بالعموم اللہ کی جو صفات یا اسماءِ حسنیٰ آتے ہیں‘ ان کا مضمون سے گہرا ربط وتعلق ہوتا ہے‘ ان پر سے سرسری طور پر گزرنا نہیں چاہئے۔ یہاں دو صفات کی وساطت سے بتایا جا رہا ہے کہ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست اختیار واقتدار رکھنے والا ہے۔ اس کی ذاتِ والا صفات فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے‘ وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ پورے عرب کے مشرک قبائل اور یہود کے دو قبیلے متحدہ محاذ بنا کر اسلامی تحریک کو بالکلیہ نیست و نابود کرنے کے لئے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ لیکن تقریباً ایک ماہ کے طویل محاصرے کے بعد قدرتِ الٰہی کا کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی‘ کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا نقشہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آندھی نے دشمنوں کے خیمے تلپٹ کر دیئے تھے اوران کے اندر شدید افراتفری مچ گئی تھی۔ مشرکین عرب کا یہ متحدہ محاذ قدرتِ الٰہی کا یہ کاری وار سہہ نہ سکا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح جب

مسلمان اٹھے تو میدان خالی تھا جس کو دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے تھے: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) ”اب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔“

غزوۂ بنو قریظہ — غزوۂ احزاب کا ضمیمہ وتتمہ

آگے چلئے! غزوۂ احزاب کا جو ضمیمہ اور تتمہ ہے‘ یعنی غزوۂ بنی قریظہ‘ اس کا نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اس رکوع کی آخری دو آیات میں ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کو علیحدہ عنوان کے تحت بیان کیا جاتا ہے‘ لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر یہاں غزوۂ احزاب کے ضمن میں ایک Appendix کے طور پر کیا گیا ہے۔

ان دو آیات کے مطالعے سے قبل رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت مدینہ منورہ میں یہود کے جو تین قبائل آباد تھے ان کے متعلق تھوڑا سا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجئے۔ یہ قبیلے تھے بنو قینقاع‘ بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ نبی کریم ﷺ کا کمال تدبر یہ تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد آپؐ نے ان تینوں قبائل کو ایک معاہدے کا پابند کر لیا تھا۔ حضورؐ کی اس کمالِ فراست کو میں جو بھی خراجِ تحسین پیش کروں گا‘ وہ عقیدت میں شمار ہو سکتا ہے‘ لیکن اس تدبر وفراست پر مستشرقین کمال درجہ کا خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں۔ وہ ایچ جی ویلز ہوں‘ منٹگمری واٹ ہوں یا دوسرے مستشرقین ہوں‘ انہوں نے حضورؐ کے کمال تدبر اور پیش بینی کی جو مدح سرائی کی ہے‘ وہ کافی ہے۔ اصل تعریف وشہادت تو وہ ہے جو اَعداء دیں۔ مدینہ میں بسنے والے اوس وخزرج کے اکثر لوگ ایمان لے آئے تھے۔ یہی دو قبیلے اصلاً مدینہ کے رہنے والے تھے‘ جبکہ یہود باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ اوس وخزرج کی دعوت پر ہی باذنِ الٰہی حضور ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اور یہاں تشریف آوری کے بعد آپؐ کی حیثیت مدینہ کے امیر‘ حاکم اور مقتدرِ اعلیٰ کی ہو گئی۔ آپؐ نے ان یہودی قبائل کو اس معاہدے میں جکڑ لیا کہ اگر باہر سے مدینہ پر کوئی حملہ آور ہوا تو سب مل کر دفاع کریں گے۔ یہ معاہدہ تھا جو یہود

کے گلے کا طوق بن گیا۔ یہ معاہدہ نہ ہوتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ واللہ اعلم!

اپنی جگہ پر ایک دوسری بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مسلمان قوم جب بگڑتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر ''وھن'' پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لفظ ''وھن'' کی حضور ﷺ نے تشریح یوں فرمائی ہے کہ: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ ۔ یعنی اس قوم میں دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ دشمن کے مقابلہ میں کمزور ہو جاتی ہے۔ یہود اُس وقت کی بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی۔ ان کے اندر وہ ضعف تھا کہ سورۃ الحشر میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ ''(اے مسلمانو!) یہ یہود کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے' لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔'' ان یہودیوں کے برعکس مشرکین نے کھلے میدانوں میں آ کر جنگ کی ہے۔ ابوجہل نے غزوۂ بدر میں اپنے معبودانِ باطل اور اپنے اوہامِ باطلہ کے لئے دوبدو ہو کر میدانِ جنگ میں گردن کٹوائی۔ لیکن یہود کا معاملہ یہ ہے کہ جب لڑیں گے تو فصیلوں پر چڑھ کر عورتوں کی طرح پتھراؤ کریں گے۔ پھر یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں' از روئے الفاظ قرآنی: ﴿بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ﴾ (آیت ۱۴) تم ان کو اکٹھا سمجھتے ہو' حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تم ان سے گھبراؤ نہیں۔ بظاہر ان کی جمعیت بہت مرعوب کن ہے' یہ بہت پیسے والے ہیں' ساز و سامان بھی ان کے پاس وافر موجود ہے' اسلحہ بھی ان کے پاس بہت ہے' ان کے پاس گڑھیاں ہیں' قلعے ہیں۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ یہ اندر سے اتنے بودے تھے کہ ان میں میدان میں آ کر لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر ان تمام کمزوریوں کے علی الرغم نبی اکرم ﷺ نے ان کو معاہدے میں جکڑ لیا تھا۔

اب یہ ہوا کہ یہ مختلف مواقع پر اس معاہدے پر تلملاتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ شجاع بنوقینقاع تھے۔ آہن گری اور زرگری کے پیشے کے اعتبار سے ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور سامان حرب اسلحہ وغیرہ بھی کافی تھا۔ غزوۂ بدر کے بعد سب سے پہلے ان کی طرف سے نقضِ عہد ہوا اور اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی۔ حضور ﷺ نے فوراً اقدام فرمایا اور ان کو مدینہ بدر ہونا پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ بڑی رعایت برتی' ان کو اپنا تمام ساز و سامان لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اونٹوں پر اپنا تمام اسباب لاد کر گاتے بجاتے ایک جشن کی صورت میں مدینہ سے نکلے۔ یہ پہلا معاملہ تو ۲ ھ میں بدر کے بعد بنوقینقاع کے ساتھ ہو گیا۔ غزوۂ اُحد کے بعد یہی معاملہ بنونضیر کے ساتھ پیش آیا۔ اُحد میں مسلمانوں کی عارضی ہزیمت سے ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور یہ قبیلہ دلیر ہو کر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خود نبی اکرم ﷺ کو شہید کرنے کی سازش تک کر ڈالی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس قبیلے کو بھی مدینہ بدر کر دیا اور یہ دونوں قبیلے خیبر کے آس پاس جا کر آباد ہو گئے' جہاں یہودی پہلے سے آباد تھے اور انہوں نے بڑی مضبوط قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں۔

اہل ایمان کے خلاف مشرکین عرب اور یہود کی مشترکہ سازشیں

ان دونوں قبیلوں کو اسلام اور حضور ﷺ سے دلی عداوت تو پہلے ہی سے تھی۔ مدینہ سے جلاوطنی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ قبیلے خیبر میں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف عرب کے مشرک قبائل کو بھڑکانے اور مدینہ پر چڑھائی کرنے پر اکسانے کے لئے مسلسل سازشیں کرتے رہے۔ ان کے سردار' ان کے شعراء اور ان کے خطیب مشرکین کے قبیلوں میں جا کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ چنانچہ ۵ ھ میں غزوۂ احزاب میں ہر چہار سمت سے عرب کے مشرک قبائل نے مدینہ پر جو یلغار کی وہ انہی یہود کی سازش کا نتیجہ تھی اور اس یلغار کی نقشہ بندی میں بھی یہی یہودی پیش پیش تھے۔ اس موقع پر' جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' حملہ آور لشکریوں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اتنی بڑی جمعیت اس سے قبل کبھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ حملہ اچانک ہوتا تو سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہو سکتا تھا۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ آپؐ کو دشمنوں کی نقل و حرکت کی برابر اطلاعات ملتی

رہتی تھیں۔ آپؐ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے پر دفاع کے لئے جبلِ اُحد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا۔ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ اسی طرف سے حملہ ہوسکتا تھا، بقیہ سمتوں میں قدرتی رکاوٹیں موجود تھیں۔ کفار ومشرکین اس طریقِ دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرے کے لئے مجبور ہونا پڑا، جس کے لئے وہ تیار ہوکر اپنے ٹھکانوں سے نہیں آئے تھے۔

اب ان کے لئے ایک ہی چارۂ کار رہ گیا تھا کہ وہ بنوقریظہ کے یہودی قبیلے کو مدینہ منورہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ کرنے پر آمادہ کریں۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ طے تھا کہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کریں گے لہٰذا اس طرف سے بےفکر ہوکر مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس سمت میں دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا بلکہ اپنی عورتیں اور بچے بھی ان گڑھیوں میں بھجوا دیئے تھے جو بنوقریظہ کی جانب تھیں۔ کفار نے مسلمانوں کے دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا اور انہوں نے بنوقریظہ کے سرداروں کے پاس سفارت بھیج کر ان کو غدّاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اوّل تو وہ ہچکچائے کہ ہمارا محمد (ﷺ) سے معاہدہ ہے اور ہم کو اُن سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ابتداء میں ان کا موقف یہی تھا، لیکن اس کے بعد حُیَی بن اَخطب نے ان کو مزید دلائل دیئے کہ ''دیکھو میں عرب کی متحدہ قوت کو محمدؐ پر چڑھا لایا ہوں، اسلام کو ختم کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اتنے بڑے لشکر آئندہ کبھی جمع نہیں ہوسکیں گے اور پھر ساری عمر ہم سب کو کفِ افسوس ملنا پڑے گا، کیونکہ پھر محمد (ﷺ) کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا''۔ ابنِ اخطب کی ان باتوں سے بنوقریظہ پر بھی معاہدے کی پاسداری اور اخلاقی اقدار کے لحاظ پر اسلام دشمنی غالب آ گئی اور وہ نقضِ عہد پر آمادہ ہوگئے۔

نبی اکرم ﷺ اس صورتِ حال سے بےخبر نہیں تھے۔ آپ ﷺ کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ آپؐ نے انصار کے سرداروں میں سے حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ نیز دو اور حضرات (رضی اللہ عنہم) کو بنوقریظہ کے پاس بھیجا کہ جا کر تحقیق کر کے آئیں کہ صورتِ حال کیا ہے! ادھر خود اہل ایمان کے لشکر میں منافقین کا ففتھ کالمسٹ عنصر موجود تھا۔ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے خبریں پھیلا رہے تھے کہ اب بنوقریظہ کی جانب سے بھی حملہ ہوا چاہتا ہے، لہٰذا ہوش کے ناخن لو اور اپنے گھروں کی خبر لو جو جنوب مشرقی گوشے سے بنوقریظہ کی براہِ راست زد میں ہیں۔ آیت ۱۳ میں منافقین کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا﴾ ''اے یثرب کے لوگو! تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پس پلٹ چلو''۔ نبی اکرم ﷺ نے جن سرداروں کو بنی قریظہ سے گفت وشنید کے لئے بھیجا تھا، ان کو تاکید فرمائی تھی کہ اگر تم دیکھو کہ بنوقریظہ اپنے عہد پر قائم ہیں تو تم آ کر سارے لشکر کے سامنے علی الاعلان خوش خبری دینا کہ یہ محض افواہ ہے، اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن اگر وہ نقضِ عہد کا فیصلہ کر چکے ہیں تو صرف مجھے اشارۃً اس کی اطلاع دینا، عام لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے حوصلے مزید پست ہو جائیں۔ ان حضرات نے واپس آ کر حضور ﷺ کو اشارہ وکنایہ میں بنوقریظہ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اس لئے کہ بنوقریظہ کے سرداروں نے ان انصار سے برملا کہہ دیا تھا کہ لَا عَقْدَ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَهْدَ ''ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین کوئی عہد وپیمان نہیں ہے۔''

بنوقریظہ کی غداری اور نُعیمؓ بن سعود کی حکمتِ عملی

غزوۂ احزاب میں سب سے زیادہ تشویشناک صورت بنوقریظہ کی اس غداری سے بنی تھی۔ اس لئے کہ نہ صرف اسلامی لشکر کا عقب محفوظ نہیں رہا تھا بلکہ وہ گڑھیاں اور مدینہ منورہ کا شہر بھی محفوظ نہیں رہے تھے جہاں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کی شاخ اشجع سے ایک صاحب نُعیم بن سعودؓ مسلمان ہوکر حضور ﷺ کی خدمت میں خفیہ طور پر حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرے اسلام قبول کرنے کا ابھی کسی کو علم نہیں ہے، آپؐ اِس وقت جو چاہیں مجھ سے خدمت

لے سکتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم جا کر ان اَحزاب اور بنوقریظہ میں پھوٹ ڈالنے اور عدم اعتماد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ چنانچہ انہوں نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ وہ پہلے بنوقریظہ کے پاس گئے جہاں ان کا پہلے ہی سے آنا جانا تھا اور وہ وہاں متعارف تھے اور ان کے سرداروں سے کہا کہ ''قریش اور غطفان کے قبائل تو محاصرے کی طوالت سے تنگ آ کر بغیر لڑے بھڑے واپس بھی جا سکتے ہیں' ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا' لیکن تم کو یہیں رہنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں تمہارا کیا حشر ہوگا؟ اس کو بھی سوچ لو۔ میری رائے ہے کہ تم اُس وقت تک کوئی اقدام نہ کرنا جب تک باہر سے آئے ہوئے ان قبائل کے چند سربرآوردہ لوگ تمہارے پاس بطور یرغمال نہ ہوں۔''
بنوقریظہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یہ مطالبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ''میں بنوقریظہ کے پاس سے آ رہا ہوں' وہ کچھ متذبذب معلوم ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تم سے یرغمال کے طور پر چند آدمی طلب کریں اور پھر انہیں محمد (ﷺ) کے حوالے کر کے ان کے ساتھ از سرِ نو اپنا معاملہ استوار کر لیں' اس لئے ان کے ساتھ ہوشیاری سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ سردارانِ لشکر یہ بات سن کر ٹھٹک گئے۔
انہوں نے بنوقریظہ کو کہلا بھیجا کہ ہم اس طویل محاصرے سے تنگ آ گئے ہیں' اب ایک فیصلہ کن معرکہ ہونا ضروری ہے۔ کل تم اپنی سمت سے بھرپور حملہ کرو' ادھر سے ہم یکبارگی مسلمانوں پر یلغار کر دیں گے۔ بنوقریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک آپ اپنے چند چیدہ آدمی بطورِ یرغمال ہمارے حوالے نہیں کریں گے' ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ انہوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دونوں فریق اپنی اپنی جگہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نُعیم کی بات سچی تھی۔ نتیجتاً نُعیم بن سعودؓ کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی اور دشمنوں کے کیمپ میں بداعتمادی اور پھوٹ پڑ گئی۔

بنوقریظہ کے خلاف اقدام کا فیصلہ

بنوقریظہ نے اگرچہ عملاً غزوۂ احزاب میں کوئی حصہ نہیں لیا ـــــ لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ فسخ کر چکے تھے اور انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ ''لَا عَقْدَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَهْدَ''۔ لہٰذا اب جب کہ غزوۂ احزاب اس معنی میں ختم ہوا کہ مشرکین عرب کے تمام لشکر محاذ چھوڑ کر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے تو نبی اکرم ﷺ اپنے ہتھیار اتار رہے تھے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ ''اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ہتھیار اتار رہے ہیں جبکہ ہم نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے جا کر بنوقریظہ کا محاصرہ فرمائیے''۔ چنانچہ اسی وقت حضور ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز بنوقریظہ کی بستی میں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث کے مابین اختلاف کی حقیقت

اب یہاں ایک اہم بات بھی لگے ہاتھوں بیان کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں جو دو مکاتیب فکر ہیں' یعنی اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث' ان کے مابین اصل اختلاف کیا ہے! وہ نوٹ کر لیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔ معنی کیا تھے؟ یہ کہ جلد سے جلد پہنچو! اللہ کا حکم ہے' حضرت جبریلؑ نے آ کر بتایا ہے۔ پس جلد پہنچنے کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ عصر سے پہلے پہلے پہنچ جاؤ تاکہ ان کا معاملہ چکا دیا جائے۔ اب راستے میں صورت یہ پیش آ گئی کہ ایک ٹکڑی ابھی بنوقریظہ تک نہ پہنچ پائی تھی کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ لشکر مختلف ٹکڑیوں میں منزل کی جانب بڑھ رہا تھا' کئی میل کا سفر تھا۔ جس ٹکڑی کو راستہ ہی میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو نماز قضا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اب ان لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہوا۔ ایک فریق نے کہا کہ حضورؐ کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہاں پہنچے بغیر عصر مت پڑھو' بلکہ منشا یہ تھا کہ ہم عصر سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ لیکن اگر کسی وجہ اور مجبوری سے درمیان ہی میں عصر کا وقت ہو گیا ہے تو ہمیں نماز پڑھ لینی چاہئے۔ لیکن دوسرے فریق نے کہا کہ نہیں' جو حضور ﷺ نے فرمایا ہے ہم تو اسی کے مطابق عمل کریں گے۔ حضور ﷺ نے تو ''منشا'' بیان نہیں فرمایا' لہٰذا ہم تو رسول اللہ ﷺ کے الفاظ کی

پیروی کریں گے اور عصر کی نماز بنو قریظہ کی بستی تک پہنچنے سے قبل نہیں پڑھیں گے‘ چاہے نماز قضا ہو جائے۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق عمل کر لیا۔ جب حضورﷺ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں نے صحیح عمل کیا۔

اب یہ ہے وہ حکمت جو محمد رسول اللہﷺ ہمیں تعلیم فرما گئے ہیں۔ لہٰذا اختلافات کو کھلے دل سے سمجھئے اور خواہ مخواہ رائے‘ تعبیر اور اجتہاد کے اختلاف پر مستقل طور پر من دیگرم تو دیگری کا رویہ اختیار نہ کیجئے۔ یہ تفرقہ وحدتِ اُمت کے لئے سمِ قاتل ہے۔ ایک رویہ یہ ہے کہ حدیث کے جو الفاظ (letters) ہیں‘ ہم تو بالکل حرف بہ حرف‘ ہو بہو‘ literally اُس پر عمل کریں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ علت کیا ہے‘ اور حکمت کیا ہے؟ وہ اللہ جانے اور اس کا رسولؐ جانے۔ اگر مسواک کا لفظ حدیث میں آیا ہے تو ہم تو مسواک ہی استعمال کریں گے۔ جبکہ دوسرا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ مسواک کرنے کی اصل غایت و علت دانت صاف رکھنا ہے‘ اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش سے دانت صاف کر لئے تو مقصد پورا ہو گیا۔ اس طرح یہ دو مکاتیب فکر ہیں۔ ایک اصحابِ حدیث جو حدیث کے الفاظ کو جوں کا توں اختیار کرنے کو صحیح اور اقرب الی السنہ سمجھتے ہیں اور اسی طرزِ عمل میں عافیت خیال کرتے ہیں۔ دوسرے اصحاب الرائے ہیں جو غور و تدبر کرتے ہیں کہ کسی حدیث کی اصل حکمت کیا ہے‘ اس کی غرض و غایت کیا ہے! نبی اکرمﷺ نے دونوں قسم کے طرزِ عمل کی تصویب فرمائی ___ یہ اللہ کا شکر اور اس کا کرم و فضل ہے کہ اس معاملے میں اس نے اپنے رسولﷺ سے دونوں طرزِ عمل کی تائید کرا دی۔ اس لئے کہ دونوں کی نیت دراصل تعمیل حکم اور اتباع تھا۔ پس ہم کو بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ دونوں attitudes کے لئے اپنے دل میں کشادگی پیدا کریں۔ عمل تو ایک ہی پر ہو گا‘ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یا آپ الفاظِ ظاہر پر عمل کریں گے یا اس کی حکمت و علت معلوم کر کے اسے اختیار کریں گے۔ اجتہاد کی بنیاد بھی تو یہی ہے کہ اہلِ علم احکامِ شرعیہ کی علت تلاش کریں اور دیکھیں کہ درپیش مسئلہ میں علت کس درجہ کی مشترک ہے‘ اسی کے مطابق قیاس کر کے مسئلہ کا حل نکال لیا جائے ___ تو یہ طریق تھا اصحاب فقہ کا‘ جن کو اصحاب الرائے بھی کہا گیا ہے اور اوّل الذکر طریقہ تھا اصحابِ حدیث کا۔ لیکن حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے دونوں مسلک حق ہیں‘ اس لئے کہ نبی اکرمﷺ نے اس واقعہ میں دونوں فریقوں کی تصویب فرمائی۔ یہ واقعہ اسی غزوہ کے دوران پیش آیا تھا تو میں نے چاہا کہ اسے بھی آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ نبی اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہر واقعہ میں ہمارے لئے رہنمائی ہے اور یہی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے اکمل واتم ہونے کی دلیل ہے ___ بہر حال یہ ایک ضمنی بحث تھی جو درمیان میں آ گئی۔ اب اصل موضوع کی طرف رجوع کیجئے۔

بنو قریظہ کا محاصرہ

بنو قریظہ کی گڑھیوں پر سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر بطور مقدمۃ الجیش پہنچا۔ بنو قریظہ یہ سمجھے کہ یہ ہمیں محض دھمکانے آئے ہیں۔ وہ اُس وقت تک تو بڑے طنطنے میں تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی اکرمﷺ اور مسلمانوں کی شان میں گستاخیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن جب نبی اکرمﷺ کی قیادت میں پورے اسلامی لشکر نے وہاں پہنچ کر ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا تو ان کے ہوش ٹھکانے آئے۔ انہوں نے عین آڑے وقت اور پرخطر حالات میں معاہدہ توڑ ڈالا تھا اور مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت خیز خطرے میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے پشت سے خنجر گھونپنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ یہ تو حضرت نُعیم کی جنگی چال اور حکمت عملی تھی‘ جس سے وہ مات کھا گئے۔ ان کا جرم کسی طور پر بھی قابلِ عفو نہیں تھا اور ان کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے تھی۔

جب محاصرے کی شدت‘ جو دو تین ہفتے جاری رہی‘ ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرمﷺ کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ قبیلۂ اَوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حَکَم بنایا جائے‘ وہ ان کے متعلق جو بھی فیصلہ کریں وہ فریقین تسلیم کر لیں۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو اس توقع پر حَکَم بنانے کی تجویز رکھی تھی کہ اَوس اور بنو قریظہ کے مابین مدتوں سے

حلیفانہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ ان کو امید تھی کہ وہ ان کا لحاظ کریں گے اور بنوقینقاع اور بنونضیر کی طرح ان کو بھی اپنے ساز و سامان اور مال و اسباب کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکل جانے کا فیصلہ کریں گے۔ حضرت سعدؓ کو خندق میں دشمنوں کا ایک تیر لگ گیا تھا اور وہ شدید زخمی تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے علاج معالجہ کے لئے مسجد نبویؐ میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا۔ حضور ﷺ خود ان کی تیمارداری فرما رہے تھے اور آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ان کے زخم کو داغا تھا۔ حضور ﷺ کو حضرت سعدؓ سے بہت محبت تھی۔ انصار میں دو سعد تھے۔ ایک سعدؓ بن معاذ جو قبیلۂ اوس کے رئیس تھے اور دوسرے سعدؓ بن عبادہ جو قبیلۂ خزرج کے رئیس تھے۔ خود حضرت سعدؓ بن معاذ کو بھی نبی اکرم ﷺ سے انتہائی محبت تھی۔ ان کی بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح فدویت کی کیفیت تھی۔

حضرت سعدؓ بن معاذ کا تورات کے مطابق فیصلہ

حضرت سعدؓ بن معاذ ایک ڈولی میں بنوقریظہ کی بستی میں لائے گئے۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا وہ عین یہود کی شریعت کے مطابق تھا' کہ بنوقریظہ کے تمام جنگ کے قابل مردوں کو قتل کر دیا جائے' عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے میں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ حضرت سعدؓ اس غزوہ میں دیکھ چکے تھے کہ بنوقینقاع اور بنونضیر کو مدینہ سے نکل جانے دیا گیا تو وہ گرد و پیش کے سارے قبائل کو بھڑکا کر قریش کی سرکردگی میں تقریباً بارہ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے۔ چنانچہ حیاتِ طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہوا ہے جو بنوقریظہ کے ساتھ ہوا۔ اگر یہ نبی اکرم ﷺ کو حَکَم تسلیم کر لیتے جو انتہائی رؤف اور رحیم تھے تو وہ شاید اس انجامِ بد سے بچ جاتے' لیکن مشیتِ الٰہی یہی تھی' اس لئے ان کی مت ماری گئی اور انہوں نے حضور ﷺ پر عدم اعتماد کیا ـــــ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' حضرت سعدؓ بن معاذ نے یہ فیصلہ عین تورات کے مطابق کیا تھا۔ بنوقریظہ اسی انجام کے مستوجب تھے' کیونکہ انہوں نے اس وقت جبکہ مسلمانوں کے لئے انتہائی کٹھن وقت تھا' عقب سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمان بنوقریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو اِن کو پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لئے ان غداروں نے پندرہ سو تلواریں' تین سو زرہیں' دو ہزار نیزے اور پندرہ سو ڈھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید شاملِ حال نہ ہوتی تو ایک طرف مشرکین یکبارگی خندق عبور کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے اور دوسری طرف یہ سارا جنگی سامان عین عقب سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے بنوقریظہ استعمال کرتے۔

غزوۂ بنوقریظہ پر قرآن کا تبصرہ

زیرِ درس رکوع کی بقیہ دو آیات کا تعلق اسی بنوقریظہ کے واقعہ سے ہے' اس لئے میں نے قدرے تفصیل سے صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو ان آیات کے پس منظر سے براہِ راست متعلق ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ کیجئے۔ فرمایا:

﴿وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا ۞﴾

''اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا (یعنی بنوقریظہ) تو اللہ ان کی گڑھیوں سے ا□ اتار لایا اور ان کے دلوں میں اُس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے کو قید کر رہے ہو۔''

بنوقریظہ □ تو محاصرے کی حالت میں اپنے قلعوں پر چڑھے رہے لیکن دو تین ہفتوں سے زیادہ سہار نہ سکے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے قلعوں سے □ اتار لایا۔ یہاں ظَاهَرُوْهُمْ کا لفظ قابل توجہ ہے۔ اس کی اصل ظَهَرَ ہے۔ باب مفاعلہ میں اس سے مُظَاهَرة بنتا ہے۔ ظہر پیٹھ کو کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں آخری مقابلہ پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ہوتا تھا۔ اگر کوئی چھوٹی سی نفری کسی بڑی نفری کے گھیرے میں آ جاتی تھی تو چھوٹی نفری والے باہم پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح اس کا مفہوم ہوگا کسی

مقصد کے غلبہ کے لئے یک جان ہوکر کام کرنا——اس لئے میں نے اس آیت کی ترجمانی میں ''حملہ آوروں کا ساتھ دینا'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ''صِیصٌ'' کی لغوی بحث کو بھی سمجھ لیجئے۔ صِیصٌ مرغ کے □ کو کہتے ہیں' اس کی جمع ''صَیَاصِی'' ہے۔ چونکہ مرغ اپنے پنجوں سے دفاع کرتا ہے' لہٰذا عرب اس لفظ کو استعارتاً دفاعی قلعوں اور گڑھیوں کے لئے استعمال کرنے لگے——بنوقریظہ نہ تو حملہ آوروں کا ساتھ دے سکے اور نہ ان کے قلعے ان کو پناہ دے سکے اور وہ ان سے □ اترنے اور باہر نکل کر خود کو نبی اکرمﷺ کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگئے۔

اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگئے۔ آپ غور کیجئے کہ اگر وہ دوبدو لڑنے کا فیصلہ کرتے تو ان کے جو چھ سات سو مرد قتل ہوئے تھے یہ سو دو سو مسلمانوں کو بھی شہید کر سکتے تھے۔ انہوں نے جو ساز و سامان جمع کر رکھا تھا' اس کی تفصیل میں بیان کر چکا ہوں' لیکن اسلحہ استعمال کرنے کے لئے ہمت اور جوش و ولولہ درکار ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کو ''وَھَن'' کی بیماری لگ جاتی ہے' یعنی حُبِّ دُنیا اور موت کا خوف' تو یہ حال بھی ہوتا ہے کہ میزائل تک دھرے رہ جاتے ہیں اور فوج کو اُن کے بٹن دبانے کی جرأت □ ہوتی اور وہ جان بچانے کے لئے اپنی جوتیاں چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ یہ معاملہ کئی مواقع پر مسلمانوں کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ صحرائے سینا سے مصری فوج اسرائیل کے حملے کے وقت بھاگ گئی تھی۔ اسی طرح فتنۂ تاتار کے دور میں جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو تاریخ بتاتی ہے کہ بغداد کے بازاروں میں سو مسلمان کھڑے ہوتے تھے اور ایک تاتاری آ کر اُن سے کہتا تھا کہ میرے پاس اس وقت تلوار □ ہے' میں یہ لے کر آتا ہوں' خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے——اور وہ تلوار لے کر آتا تھا اور ایک ایک کی گردن مارتا تھا اور کسی کو جرأت □ ہوتی تھی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ بنوقریظہ میں جرأت و ہمت ہوتی تو حضرت سعدؓ کے فیصلے کے بعد بھی یہ کر سکتے تھے کہ یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں کہ ہمیں تو مرنا ہی ہے' سو پچاس کو ساتھ لے کر مریں گے' لیکن

اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہوگئے۔ ان کے مرد قتل کئے گئے اور ان کی عورتیں' بچے اور بچیاں غلام اور لونڈیاں بنائی گئیں۔

اس پوری صورت حال پر صرف ایک آیت میں تبصرہ فرما دیا گیا:

﴿وَاَوۡرَثَكُمۡ اَرۡضَهُمۡ وَدِيَارَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ وَاَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرًا ۞﴾

''اور اللہ نے تمہیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دے دیا جسے تم نے پامال □ کیا تھا' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

بنوقریظہ ایک بڑا یہودی قبیلہ تھا' بہت مالدار اور سرمایہ دار—— ان کے بڑے بڑے باغات اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں' بے شمار مال و متاع تھا—— یہ پورا علاقہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بغیر لڑے بھڑے عطا کر دیا۔ جنگ تو ہوئی ہی □ ۔ صرف محاصرے کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہاتھ آ گیا۔ اس زمین پر گھوڑے دوڑے ہی □ کہ وہ پامال ہوتی۔

اس رکوع کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرًا ۞﴾ اور واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کا اس سے جامع اختتام ممکن ہی □ تھا۔ غزوۂ احزاب کی پوری صورتِ واقعہ اور بنوقریظہ کا خاتمہ' یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کی شان کے مظاہر ہی تو تھے۔ سورۃ یوسف میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمۡرِهٖ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۞﴾ ''اللہ غالب ہے' وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے' لیکن اکثر لوگ جانتے □ ہیں۔'' اگر لوگوں کو یہ یقین قلبی ہو جائے تو اسی سے ما□' اسی سے جڑیں' اسی کے دامن سے وابستہ ہو جائیں۔ ا□ تو اُن وسائل اور اسباب پر یقین و توکّل ہوتا ہے جو ان کی دسترس میں ہوں۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا:

((اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدَيِ اللّٰهِ))(سنن الترمذی' کتاب الزھد)

''دنیا میں زہد اس چیز کا نام □ ہے کہ تم حلال کو اپنے اوپر حرام کر لو اور مال کو

ضائع کرو، بلکہ دراصل زہد یہ ہے کہ اللہ پر تمہارا اعتماد وتوکل اس سے زیادہ ہو جو تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے''۔

اگر تم اپنے وسائل، اپنے ذرائع، اپنی صلاحیتوں، اپنی ذہانت اور اپنی قوت کو مقدم رکھو گے اور ان پر تکیہ کرو گے تو تم کو زہد چھو کر بھی □ گیا۔ لیکن اگر تم کو اللہ کی توفیق، اللہ کی تائید، اللہ کی نصرت اور اللہ کی قدرت پر ہی اعتماد وتوکّل اور بھروسہ ہو جائے تو یہ اصل زہد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ ہم نے آج اس رکوع کا مطالعہ ختم کر لیا۔ جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا تھا کہ ہم اس رکوع کے مطالعہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں آپؐ کے اُس ''اُسوۂ حسنہ'' کو مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے جو غزوۂ احزاب کے پس منظر میں اس رکوع میں بیان ہوا ہے۔ پورے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے ''اسوۂ حسنہ'' کا تذکرہ اسی ایک مقام پر کیا گیا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر تو نبی اکرم ﷺ پر خود آپؐ کے ارشاد کے مطابق سب سے سخت دن ''یومِ طائف'' گزرا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت پر سب سے زیادہ ابتلاء وآزمائش کا مرحلہ یہ غزوۂ احزاب ہے، جس میں جانی نقصان تو اگرچہ بہت کم ہوا لیکن اس محاصرے کے دوران، جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کو جن شدائد ومصائب اور تکالیف سے سابقہ پیش آیا ان کو بجا طور پر ابتلاء کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ دی ہے: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝﴾

آج کا یہ درس ان لوگوں کے لئے انتہائی سبق آموز ہے جو بفضلہٖ تعالیٰ شعوری طور پر یہ بات جان چکے ہیں کہ اعلائے کلمۃ اللہ، اظہار دین الحق اور اقامت دین، نبی اکرم ﷺ کے ہر اُمتی پر فرض ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی تقریر میں حضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے مختلف پہلو اُجاگر کروں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ